

# اسلام اور دیگر مذاہب فکر

پروفیسر محمد مبارک

آج ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبیں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہی ہیں۔ ایسے ادوار میں عموماً یہی ہوا کرتا ہے کہ بہت سے مفہوم مشتبہ ہو جایا کرتے ہیں۔ بہت سے عقائد ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہو جاتے ہیں اور بہت سے مذاہب ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ گذشتہ ادوار کی طرح اسلام آج بھی اسی دور ابتلاء سے گذر رہا ہے کہ کبھی تو اس کے بعض افکار پر دبیز پردے پڑ جاتے ہیں اور بعض اوقات ان میں کچھ اشتباہات راہ پالتے ہیں جو انہیں مشکوک بنا ڈالتے ہیں۔ لہذا اسلام کو اس کی اصلی صاف و شفاف صورت میں سمجھنے کے لئے ایک طرف تو اسلام کے ابتدائی اصول اور سرچشموں یعنی قرآن اور سنت کی طرف رجوع کرنا اور ابتدائی دور کے حالات و کوائف کو اچھی طرح سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ اور دوسری طرف ان حجابات کا دور کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے اسلام کے روشن چہرے کو چھپا لیا ہے۔ نیز ان اسباب و عوامل کو دریافت کرنا انتہائی ضروری ہے جنہوں نے اسلام کے بعض تصورات کو تبدیل کر دیا ہے۔

## اسلام اور دور جدید

اسلام کو اس عہد میں چند مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ پہلا مرحلہ تو وہ تھا جسے ہم یوں کہیں تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ ایک عرصہ تک اغیار کا مطعون رہا۔ چنانچہ گذشتہ عہد میں اسلام کے داعی اور مبلغ، اسلام

کی طرف سے بعینہ اس انداز سے مدافعت کرنے میں مشغول رہے گویا اسلام واقعی قصوروار ہے۔ چنانچہ ان حضرات کا مارا زور ان مدافعتوں ہی پر صرف ہوتا رہا کہ اسلام، ترقی کے راستہ میں رکاوٹ نہیں، نہ وہ آگے بڑھنے سے روکتا ہے، اور نہ علم و عقل کا معارض ہے۔ گویا اسلام کی حیثیت قطعاً ایک مجرم کی سی تھی جس کی طرف سے صفائیاں پیش کی جا رہی تھیں۔ اس کا اندازہ آپ کو ان اسلامی تصانیف سے ہوسکے گا جو گذشتہ ایک صدی سے ہمارے علماء مرتب کرتے آ رہے ہیں۔ اس کی مثال میں مفتی محمد عبدہ اور فرید وجدی (سر سید احمد خان اور سید امیر علی) وغیرہ حضرات کی کتابیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ آیا جس میں اسلام تہمت کی زد سے تو باہر ہوچکا تھا لیکن اس کا تجزیہ یا اس کا موازنہ ان آلات اور پیمانوں سے کیا جانے لگا جو اسلام کے اپنے آلات اور پیمانے نہیں تھے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ان سکون سے لگایا جانے لگا جو خود اسلام کے اپنے سکون نہیں تھے۔ چنانچہ کہا جانے لگا کہ اسلام ایک صالح مسلک زندگی ہے اس لئے کہ وہ جمہوریت پر مبنی ہے۔ وہ زندہ رہنے اور ہمیشہ باقی رہنے کا اس لئے مستحق ہے کہ اس میں لچک پائی جاتی ہے۔ اسلام اس لئے اچھی چیز ہے کہ اس میں فلاں فلاں افکار پائے جاتے ہیں۔ اور یہ تمام افکار، تصورات، سکے اور پیمانے وہ تھے جو سب کے سب دیگر مذاہب سے مستعار لئے گئے تھے۔ گویا اصل بات یہ تھی کہ ہم ان مخصوص و متعین مذاہب پر ایمان لاکچکے تھے جو اسلام کے احاطہ سے خارج تھے اور اس کے بعد ہم یہ کوشش کر رہے تھے کہ ان سکون کے ذریعہ جنہیں ہم نے ان مذاہب سے مستعار مانگا تھا، اسلام کی قدر و قیمت متعین کر سکیں۔ کیونکہ وہ سکے ہمارے نزدیک بھی مسلم تھے اور ان مذاہب کی پیداوار تھے، جن پر ہم خود بھی ایمان لاکچکے تھے۔ یہ دوسرا مرحلہ تھا جس سے اسلام گذرا ہے۔ مگر اسلام ابھی تک پوری طرح اس مرحلہ سے نکل نہیں سکا۔ آج بوی اسلام کی پیمائش زیادہ تر انہیں غیر اسلامی پیمانوں ہی سے کی جا رہی ہے۔ بجز چند اسلامی ممالک کے جہاں خود نگری و خود بینی کی ابھی محض ابتداء ہے۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ آیا اور یہی وہ مرحلہ ہے جس کی میرے خیال میں

ابتداء ہو چکی ہے اور جو میری رائے میں اسلام کا اپنا ذاتی مرحلہ ہے - اسلام کے کچھ اپنے خاص پیمانے اور ذاتی معیار ہیں - وہ ایک صالح مسلک زندگی اس لئے نہیں ہے کہ وہ جمہوریت، اشتراکیت یا سرمایہ داری سے مطابقت رکھتا ہے - یا اس میں انفرادی آزادی کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے یا اس میں اجتماعی مفادات کی ضمانت موجود ہے یا اس میں فلاں فلاں خوبیوں یا فلاں فلاں تصورات پائے جاتے ہیں جو دیگر مذاہب کی پیداوار ہیں - بلکہ خیر و شر اور حق و باطل کی تمیز کیلئے اسلام کے خود اپنے پیمانے ہیں - ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان پیمانوں کی کچھ عقلی بنیادیں نہیں ہیں جن سے انہیں تقویت حاصل ہوتی ہو - بلکہ ہمارے کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کے یہ پیمانے خود وہ بنیادیں ہیں جو عقل کی سر زمین ہی سے ابھرتی ہیں اور وہ شاخیں ہیں جو عقل کے درخت ہی کے تنے سے نشو و نما حاصل کرتی ہیں - یہ وہ مرحلہ ہے جس کی ابتداء ہمارے اس عہد میں ہو چکی ہے - چنانچہ اس کے ابتدائی نقوش معدودے چند تصنیفات میں نظر آنے لگے ہیں - اور اس کے اثرات عالم اسلامی کے ابھی چند مفکرین کے اذہان پر پڑے ہیں - یہ وہ مرحلہ ہے جس کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ مستقبل قریب میں اسلام کا آخری مرحلہ ہوگا -

ضروری ہے کہ ہم ذرا پیچھے کی طرف لوٹ آئیں تاکہ ان اسباب و علل کا پتہ لگا سکیں جنکی وجہ سے ہم اجنبی سکوں سے اسلام کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے اور اسلامی تصورات کو دیگر مذاہب کے مفاہیم کے ساتھ خلط ملط کرنے میں اثر پذیر ہوئے ہیں - خصوصیت کے ساتھ اس بناء پر کہ ہم اس آخر دور میں پیدا ہوئے ہیں جس میں ہم خود انتہائی کمزور ہو چکے ہیں اور ہمارا سابقہ ایک ایسی تہذیب سے پڑا ہے جو اپنی قوت و شوکت کے اعتبار سے اوج ثریا پر فائز ہے - یہ ہے یورپ کی جدید مغربی تہذیب، جو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں مادی اعتبار سے انتہائی بلند یوں تک پہنچ چکی ہے -

## یورپ جس سے ہم دوچار ہوئے -

یورپ جس سے ہم دوچار ہوئے ، وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کا یورپ تھا - یورپ ان دونوں صدیوں میں فکری رجحانات اور اجتماعی خصوصیات کے اعتبار سے ایک بلند مقام پر فائز تھا - اسے تین امتیازی خصوصیات حاصل تھیں جو ایک دوسرے سے لازم و ملزوم تھیں - پہلی خصوصیت، دین کے خلاف بغاوت تھی - یورپ میں مسیحیت اپنے اس افسوسناک انجام سے دوچار ہو چکی تھی کہ فکری ارتقاء اور عملی تفکر کا ساتھ نہیں دے سکی جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے عہد کے بعد ظہور پذیر ہو چکا تھا - لہذا یورپ میں سخت کشمکش کا دور تھا - علم اور دین میں کشمکش - عقل اور دین میں کشمکش - یہ کشمکش بڑی شدید اور سخت تھی - اس کے بعد دوسری خصوصیت سامنے آئی جو اپنی قدر و قیمت اور خطرناک نتائج میں سابقہ خصوصیت سے کچھ کم نہ تھی - اور وہ یہ تھی کہ مشینی اختراعات اور صنعت و حرفت کی گرم بازاری نے معاشرہ میں نئے طبقات پیدا کر دیئے تھے اور سرمایہ کو محنت سے جدا کر دیا تھا - اس کا اثر یہ ہوا کہ عمال (مزدوروں اور کسانوں) کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا اور اس طبقہ کو جن اجتماعی مظالم سے سابقہ پڑ رہا تھا ان کا مقابلہ کرنے کے لئے اشتراکیت کی تحریک شروع ہو گئی - اس سے آزادی، جمہوریت اور اشتراکیت کے وہ نئے تصورات پیدا ہوئے جو ان تاریخی اور مقامی حالات ہی کی پیداوار تھے - تیسری خصوصیت ، یورپ میں قومی منافست کا ظہور تھا - اقوام یورپ اور ان کی قومیتوں کے جوش مسابقت نے ایسے مخصوص حالات کو جنم دیا جنہوں نے خود قومیت ہی کو ایسی بنیاد قرار دیدیا کہ پوری زندگی اسی کے گرد گھومنے لگی - اور قومیت کو ایسے عقیدہ کی حیثیت دیدی کہ ان کی پوری سیاسی اور فکری زندگی کی عمارت اسی پر کھڑی ہونے لگی - یہ عقیدہ بھی دراصل کچھ مخصوص حالات ہی کی پیداوار تھا اور انہیں حالات نے اسے جنم دیا تھا - وہ صرف عقلی منطق کا پیدا کردہ نہیں تھا - یہ وہ نمایاں مظاہر تھے جو یورپ میں اس عہد میں ظاہر ہو رہے تھے جب ہم اس سے دوچار ہوئے - تو اس کے نتیجہ میں فکر، اقتصاد اور سیاست

کے میدانوں میں بھانت بھانت کے متعدد نئے افکار پیدا ہونے لگے جن سے ہم متاثر ہوتے رہے۔ مثال کے طور پر ذرا ان تمثیلوں پر غور فرمائیے جو بعض افکار کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ وہ سب کی سب انہی مخصوص حالات کی پیداوار ہیں۔ ان میں وہ افکار بھی داخل ہیں جن کا تعلق دین سے ہے۔ مگر وہ بھی انہی کوائف و ظروف اور تاریخی احوال سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہمارے آج کے بہت سے اسالیب فکر وہ ہیں جو ہم نے مغرب ہی سے مستعار لئے ہیں اور اسی تہذیب سے اثر پذیری کا نتیجہ ہیں جو اس مرحلہ میں ہماری طرف منتقل ہوئی ہیں۔ اس کی ایک مثال دین اور علم یا دین اور عقل کے درمیان تصادم کی دشواری بھی ہے۔ یہ دشواری اگرچہ پرانے زمانے سے چلی آرہی ہے مگر اس نے اب سے پہلے اتنی شدت اور سرگرمی کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اسی طرح تعلیم کے سلسلہ میں دینی اور دنیوی کی الگ الگ تقسیم اور اس کے ساتھ ہی ”علمائے دین“ یا ”رجال دین“ کی اصطلاح کا حال بھی ہے۔ اگر ہم عہد عباسی کے بعد اور اس سے پہلے کی تصنیفات اور کتابوں پر غور کریں تو ہمیں اس قسم کی اصطلاحیں ان کتابوں میں کہیں بھی نظر نہیں آئیں، ان سے نہ عربی زبان مانوس ہے اور نہ ہی اسلام متعارف ہے۔ یہی حال زندگی کی اس تقسیم کا بھی ہے جو دو الگ الگ اجزاء میں اس انداز سے کردی گئی ہے کہ ان دونوں میں کبھی اتحاد و اتصال کی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ یہ دونوں اجزاء دین اور دنیا ہیں۔ چنانچہ اس تفریق کے نتیجہ میں ہیئت اجتماعیہ اور حکومت سے دین کو بالکل ہی خارج کر دیا گیا ہے۔ یعنی دین کو ایک شخصی اور ذاتی معاملہ قرار دیکر عام زندگی سے اس کو بالکل ہی بے دخل کر دیا گیا ہے۔ یہ امر بھی دراصل انہی مفہومات میں سے ہے جو ہماری طرف منتقل ہو کر آگئے ہیں۔ اس سے ایک اور رجحان پیدا ہوا جسے ”علمائیت“ (یا ”سلازم“) کہا جاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ حکومت دین سے الگ تھلگ رہے اور دینی معاملات میں دخل اندازی نہ کرے۔

اسی طرح ایک دوسرا رجحان ”لادینیت“ (یا ”سیکولرزم“) کا ہے جس کا مقصد دینی رجحانات کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ ان ہی رجحانات میں

سے اخلاق کے متعلق یہ تصور بھی ہے کہ اس کا مستقل اقدار سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہر جگہ کا اپنا اخلاق ہوتا ہے۔ یہ تصور بھی ان خصوصی حالات و کوائف ہی کی پیداوار ہے جن میں دینی اخلاق، رسمی اخلاق اور سیاسی پرانے طور طریقے، جدید انقلابی طور طریقوں کے ساتھ ٹکراتے رہے۔ حالانکہ اس سے پیشتر ایک مدت دراز تک انہی اخلاق اور طور طریقوں کا دور دورہ رہ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ یہ حقائق اور احکام نیز اخلاقی اقدار ہزارہا سال سے مسلم چلے آ رہے ہیں۔ مثلاً غیظ و غضب کا برا ہونا، دوسروں کو نقصان پہنچانے کے جذبے اور زنا کاری کے عمل کی برائی کہ دنیا کی اکثر آبادیوں میں ان برائیوں کو ہمیشہ سے ناجائز اور حرام ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ ان بعض ہیئت اجتماعیہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے، جن کے فیصلے اس کے خلاف ہوں کیونکہ اگر کہیں ایسے حالات پائے جائیں تو وہ خواہ کتنے ہی پسندیدہ کیوں نہ ہوں انہیں بہر حال شاذ و نادر ہی کے حکم میں رکھنا ہوگا۔ کسی خاص زمانہ میں کوئی خاص ہیئت اجتماعیہ اگر استبداد و ظلم کو اچھی نظر سے دیکھتی ہے تو اس سے استبداد اور ظلم مستحسن نہیں ہو جاتا۔ یہ فیصلہ بہر حال اٹل ہے کہ وہ ایک برائی ہے۔ اور اس کا مقابلہ کرنا واجب ہے۔ یہ فیصلہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔

ان ہی غلط افکار میں سے جو یورپ کی ہیئت اجتماعیہ سے وہاں کے اجتماعی حالات اور خصوصی مناہج فکر کی بناء پر یورپ میں رواج پا جائیکے بعد ہم تک منتقل ہوئے ہیں، تدریجی ارتقاء کو ایک اخلاقی قانون کی حیثیت سے تسلیم کر لینا بھی ہے۔ یعنی علی الاطلاق یہ فیصلہ کر دینا کہ ہر نیا طریقہ اس پرانے طریقہ سے افضل اور بہتر ہے جو اس سے پہلے گذر چکا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ارتقاء ایک اجتماعی اور واقعی قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کا تقاضا بہر حال یہ تو نہیں ہے کہ زندگی کا آخری انداز ہمیشہ سابق اندازوں سے بہتر ہی ہوا کرے۔ اجتماعی ارتقاء کا تصور دراصل حیاتی ارتقاء (بایولوجی) سے پیدا ہوا ہے۔ اگرچہ حیاتی ارتقاء اکثر ترقی اور بہتری کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی تنزل اور رجعت قہقری کا باعث بھی ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو بالکل یہ خاتمہ کا سبب بھی بن جاتا ہے۔

یورپ کے اکثر فلسفیانہ اور اجتماعی مسالک و مذاہب کا خیال یہ ہے کہ اخلاق کے کچھ مقررہ پیمانے اور متعین احکام نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ ہر قوم کے اپنے اپنے اخلاق ہوا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ بعضوں کے نزدیک شراب خوری ایک بدترین فعل ہے مگر بعض دوسری قومیں اس کے خلاف رائے رکھتی ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ زنا ایک بدترین اور قبیح کام ہے مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مہمان نوازی کے لئے اس کو روا سمجھتے ہیں۔ لہذا ان کے نزدیک یہ بڑی حد تک ایک نسبتی معاملہ ہے کہ بعض اخلاق بعض قوموں کی نسبت سے پسندیدہ ہو سکتے ہیں اور دوسری قوموں کی نسبت سے غیر پسندیدہ۔ ایسی کوئی مستقل اخلاقی بنیادیں یا مستقل اخلاقی اقدار نہیں ہیں جن کے مطابق ہر اخلاق کو ہر قوم کے لئے یکساں طور پر پسندیدہ یا غیر پسندیدہ قرار دیا جاسکے۔ لہذا جسے تمہارا جی چاہے تم اختیار کر سکتے ہو۔ جب کوئی ہیئت اجتماعی کسی خاص جدید اخلاقی فکر تک ترقی کر کے پہنچ جائے تو وہی چیز اخلاق بن جاتی ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ تصور بھی انہی افکار میں سے ہے جن کے متعلق میرا عقیدہ یہی ہے کہ ان حالات و کوائف کا نتیجہ ہیں جن سے یورپ گذر چکا ہے۔

مغربی ہیئت اجتماعی اور اسلامی ہیئت اجتماعی کے ٹکرائے کے نتیجہ میں جو فکری جدوجہد پیدا ہوئی ہے اور جس سے ہم گذر رہے ہیں وہ اسلامی فکر جدید پر گہرا اثر چھوڑ گئی ہے۔ حتیٰ کہ اسلامی طبقات کی بڑی اکثریت، خصوصیت کے ساتھ وہ طبقہ جو تمدن اور مہذب کہلاتا ہے بلکہ وہ طبقات بھی جو غیر مہذب کہلاتے ہیں انہی افکار سے اثر پذیر ہوئے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اسلامی اقدار پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو اسلامی اقدار کو قبول تو کرتے ہیں اور ان کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں مگر ذہنی طور پر ان کا حال بھی وہی ہے۔ دونوں ہی یکساں طور پر فکری اعتبار سے اثر پذیر ہوئے ہیں۔

### شخصیتوں کا اختلاط

متدرجہ بالا سرسری جائزہ کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ تو ایسے مسلمان ہیں جو اپنے شعائر و رسوم کے اعتبار سے تو مسلمان ہیں لیکن اپنے

افکار کے اعتبار سے غیر مسلم ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی شخصیت دراصل دو شخصیتوں کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے ایک ایسے معاشرہ میں پرورش پائی جو دینداری کا عادی تھا۔ لہذا وہ شعائر و رسوم کے اعتبار سے تو مسلمان ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے ایک ایسے معاشرہ میں بھی نشو و نما پائی ہے جن کی فکری سطح اسلامی نظریات سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ لہذا جب وہ زندگی کے کوائف و ظروف پر غور کرتے ہیں چاہے وہ عام فکری حیات سے تعلق رکھتے ہوں یا اجتماعی، اخلاقی، سیاسی یا دوسرے شعبوں سے تو وہ ان پر اسلامی فکر کے مطابق غور و فکر نہیں کرتے۔ البتہ اپنی مخصوص زندگی میں وہ مسلمان ہی سمجھے جاتے ہیں۔ فکری یا نفسیاتی اعتبار سے یہ بالکل ہی ایک نئی مخلوق ہے۔ عالم اسلامی میں دو قسم کے مخلوط نظام تعلیم رائج رہے ہیں۔ ایک تو اسلامی تعلیم کا۔ لیکن یہ نظام تعلیم اپنے طریقہ، وسائل، اور سطح کے اعتبار سے قدیم ہے جس کا سراغ ہمیں ان صدیوں میں ملتا ہے جو عباسی عہد حکومت کے بعد گذر چکی ہیں۔ دوسرا نظام تعلیم وہ ہے جس کا سرچشمہ مغرب، مغربی افکار اور مغرب کی جدید تہذیب ہے۔ اور ان نفسیاتی اور فکری اثرات نے جو بعض لوگوں میں شدت سے ظہور پذیر ہو چکے ہیں، بعض عجیب و غریب اور مخصوص نوعیت کے مظاہر پیدا کر دئے ہیں۔ مثلاً اس نوع کا ایک مظاہرہ یہ بھی ہے کہ بہت سے اسلامی احکام میں اس انداز کی تاویل کی جائے لگی ہیں جو زیادہ تر تکلف و تعسف سے خالی نہیں ہوتیں۔ ان تاویلات کا مقصد یہ ہے کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں تطبیق کی کوئی صورت نکالی جائے۔ لیکن یہ سب کچھ اسلام کی قربانی دیکر کیا جاتا ہے۔ گویا وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کا حلیہ بگاڑ کر اور اس کی قطع و برید کر کے اسے ایک ایسی بوتل میں بند کیا جاسکے جس کا دھانہ تنگ ہو۔ چاہے ایسا کرنے کے لئے انہیں اس کے ہاتھ پاؤں یا اس کے جسم کے کسی بنیادی عضو ہی کو کاٹنا چھانٹنا کیوں نہ پڑ جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس سلسلہ میں میں کچھ مثالیں پیش کروں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ یہ مثالیں میری ذاتی رائے پر مبنی ہیں۔ دوسکتا ہے کہ کچھ دوسری مثالیں اس مقام پر زیادہ بہتر ہو سکتی ہوں اور ان سے بہتر طور پر استشہاد



کرنا ممکن ہو۔

اس سلسلہ میں پہلی مثال نامور شخصیتوں کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ان کے مجسموں کا قائم کرنا ہے۔ بعض مغربی تہذیب سے متاثر ہونے والوں کا خیال ہے کہ اسلام میں مجسمہ سازی چند وجوہ سے حرام کی گئی تھی جو اب باقی نہیں رہیں لہذا اگر آج ہم اپنے سربرآوردہ نامور لوگوں کے مجسمے نصب کرنے لگیں تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام میں مجسمہ سازی اور ان کی تنصیب کی حرمت کی وجہ صرف بت پرستی کے رجحان کو روکنا ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے کہیں گہری ہے۔ نامور شخصیتوں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے اسلام نے اس انداز کو کبھی بھی اختیار نہیں کیا۔ بلکہ اس نے معنوی اور ذہنی تقدیس و عظمت اور احترام پر زور دیا ہے اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ذہنی تقدیس اور حرمت و عظمت کے اثرات مجسموں کی تنصیب سے کہیں زیادہ دیرپا اور گہرا اثر چھوڑ جانے والے ثابت ہوئے ہیں۔ آج تقریباً چودہ سو سال گذر جانے کے باوجود بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور دیگر ائمہ اور بزرگوں کی یاد مسلمانوں کے دلوں میں اس سے کہیں زیادہ تازہ ہے جو یورپ کے لوگوں کے دلوں میں ان کے جگہ جگہ اپنی نامور شخصیتوں کے مجسمے نصب کر دینے سے ہو سکتی ہے۔ میں نے پیرس، لندن، ماسکو وغیرہ میں خود اس امر کا مشاہدہ کیا ہے کہ نامور شخصیتوں کے مجسموں کے سامنے وہاں کے پڑھے لکھے تعظیم یافتہ باشندوں پر بھی وہ اثرات مرتب نہیں ہوتے جو کسی جاہل سے جاہل مسلمان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین اور دیگر بزرگان دین کا محض نام لے دینے سے مرتب ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان تمام حضرات کے مجسمے کبھی بھی کہیں نصب نہیں کئے گئے۔

مجھے عرض کرنے دیجئے کہ مجسمے وہی قومیں نصب کرتی ہیں جو قدیم ایام سے بت پرست رہی ہیں اور جن کے ہاں ہمیشہ سے یہ ذہنیت کارفرما رہی ہے کہ جب کوئی ہیرو ان کی قوم میں پیدا ہوا تو انہوں نے ہمیشہ اسے انسانوں کی صف سے الگ کر کے دیوتاؤں کی صف میں شامل کر دیا کیونکہ ان کی عقل میں کبھی یہ بات آ ہی نہیں سکی کہ ہیرو بھی انسان

ہوسکتا ہے۔ اسی ذہنیت کے ماتحت انہوں نے اپنے ہیروؤں کو دیوتا بنا کر ان کے مجسمے نصب کئے۔ آج بھی وہی ذہنیت ایک دوسرے روپ میں اپنی نمائندگی کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام اس نقطہ نظر کا حامی نہیں ہے۔

لاٹری اور سٹہ بازی بھی اسی کی ایک مثال ہے جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کا بظاہر گہرا ماحصل یہی ہے کہ اخلاق کے سرچشمے جو ایمان کی گہرائیوں سے پھوٹتے ہیں ان کے سوتے دلوں میں خشک ہو گئے ہیں۔ اور لوگ اس قدر مادہ پرست بن چکے ہیں کہ وہ مادی منفعت، اور منفعت اندوزی کے علاوہ کسی چیز کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ جب تک اشیائے صرف کی قیمتیں نہ بڑھ جائیں کسی نیک کام کے لئے ان سے ایک پیسہ وصول نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا سٹہ اور لاٹری کا ادارہ دلوں کے اخلاقی چشموں کے خشک ہوجانے پر مبنی ہے۔ دلی جذبات، اور نفس کی گہرائیوں سے جب اخلاق کے سوتے پھوٹتے ہیں تو ان کا مظاہرہ ہمیشہ قربانی اور ایثار کی شکل میں ہوتا ہے مگر یہاں تو اس کا ظہور قیمتیں بڑھانے کے خسیس اور ناجائز کسب کی صورت ہی میں ہو رہا ہے۔

اس قسم کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔ میں یہاں چند مثالیں پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس نوع کی خرافات یا اس قسم کے رجحانات کے درمیان جن کا نام میں ”تکلف و تاویل“ رکھتا ہوں اور نئے حوادث اور نئے واقعات کی کیفیات کا اندازہ لگانے کے درمیان جن کے لئے واقعی شریعت اسلامیہ سے احکام مستنبط کرنے کی ضرورت ہے فرق کرنے کا قائل ہوں۔ اس قسم کے مسائل کو میں آئندہ بیان کروں گا۔

### اسلامی مفہومات میں رنگ آمیزی

اسلامی تصورات میں رنگ آمیزی کا رجحان جو آج دوسری تہذیبوں سے نکراؤ کی بنا پر پیدا ہو رہا ہے۔ ہماری تاریخ میں کوئی انوکھا رجحان نہیں ہے۔ ہماری پرانی تاریخ بھی اس قسم کے رجحانات سے بھرپور ہے۔ اس سے پہلے ہمارا نکراؤ اور تصادم یونانی فکر کے ساتھ ہو چکا ہے اور اسی

تصادم سے پیشمار نئے رجحانات پیدا ہوئے تھے مثلاً علم کلام کے مسائل - کیونکہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ اسلامی عقیدہ نے یا زیادہ صحیح طور پر یہ کہہ لیجئے کہ اسلامی ایمان نے ————— کیونکہ عقیدہ کا لفظ بھی خود بعد کی پیداوار ہے ————— حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عہد میں یہ فلسفیانہ جدلی صورت اختیار نہیں کی تھی جو عہد عباسی میں اسے حاصل ہوئی -

اس سے پہلے ایمان کا لفظ ————— ایمان، قرآنی لفظ ہے ————— عقلی اور نفسیاتی دونوں معنوں پر مشتمل تھا - یہ دونوں رجحانات ————— یعنی عقلی اور نفسیاتی ————— ظہور اسلام کے وقت ابتدائی عہد میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے اور پوری طرح ایک دوسرے میں گٹھے ہوئے تھے - پھر ہم یکایک دیکھتے ہیں کہ اسلام کی تین الگ الگ شاخیں ہو گئیں - ایک شاخ توافقیہ کی تھی جس کا کام عبادات و معاملات کے سلسلہ میں ظاہری احکام و شعائر سے بحث کرنا تھا - دوسری شاخ وہ تھی جو اسلام کے اعتقاد عقلی کے گوشوں سے بحث کرتی تھی - اس کو ”علم کلام“ ”عقیدہ“ یا ”علم توحید“ کا نام دیا گیا - اسلام کی تیسری شاخ قلبی اور اخلاقی گوشوں سے تعلق رکھتی تھی - اسے اخلاق یا زہد کہہ لیجئے - یہ وہی شاخ ہے جو صدر اول کے بعد تصوف کے نام سے پکاری گئی - لہذا اس کا ما حاصل یہ نکلا کہ اسلام تین شعبوں سے مرکب مانا گیا، جن میں سے ہر شعبہ ایک دوسرے سے الگ تھا - فقہ - کلام - اور اخلاق -

اس گزارش سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ فقہاء اسلام کو علم کلام سے کوئی واسطہ نہیں تھا یا متکلمین، سب کے سب فقہ سے بالکل بے بہرہ ہوا کرتے تھے - یا زاہد اور واعظ حضرات کو فقہ اور عقائد سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی - بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں پر کسی ایک شعبہ کا غلبہ ہوا کرتا تھا - چنانچہ کچھ لوگ متکلم کہلاتے تھے - کچھ فقیہ کہلاتے تھے اور کچھ زاہد اور صوفی کہلاتے تھے - اگرچہ بعض شخصیتیں ایسی بھی گذری ہیں جو ان تینوں شعبوں کی جامع تھیں - بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اسلام جو کبھی ایک جامع وحدت ہوا

کرتا تھا اس کے بعد ان مختلف پہلوؤں میں بٹ گیا جو ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ خود اسلام کی اپنی صورت ہی چند گوشوں میں بٹ گئی۔ ایک اسلام تو علم کلام کا ہو گیا۔ دوسرا اسلام اخلاق کا قرار پایا گیا اور تیسرا اسلام فقہ کا سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ اسلام تو اسلام ہی ہے۔ وہ نہ کلام کا اسلام ہے نہ فقہ کا اسلام ہے اور نہ تصوف کا اسلام ہے۔ میرے نزدیک مختلف پہلوؤں والے اسلام کو ممکن ہی نہیں کہ اسلام کی مکمل اور کامل صورت سمجھا سکے۔ اسلام کے ان مختلف پہلوؤں میں بٹ جانے سے ہو سکتا ہے کہ علمی اور تدریسی اعتبار سے کچھ افراد کے لئے کسی قدر سہولت و کفایت ہو گئی ہو لیکن ظاہر ہے کہ اجزاء سے وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی جو مرکب صورت میں ایک مجموعہ کے اندر ہو سکتی ہے۔ پہلی قسم کا اسلام صدر اول یعنی صحابہ کرام کا اسلام تھا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد جمع رہتے تھے۔ یہ اسلام ان تینوں اجزاء کو مرتب، متوازن اور زندگی بخش انداز میں جمع کئے ہوئے تھا۔ لہذا یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ ہم اسلام کو (فی ذاته) ان تصورات سے الگ کر کے دیکھیں جو مختلف ادوار میں اسلام کو سمجھنے کے سلسلے میں مسلمانوں نے قائم کئے تھے۔ ایک تو وہ اسلام ہے جو اپنی اصل اور سرچشمہ کے ذریعہ سے یعنی کتاب و سنت کے ذریعہ جو اس کے اصلی مصادر ہیں، سمجھا جاسکتا ہے اور دوسرے ہر عہد کے مسلمانوں کی اپنی اپنی فہم ہے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں بعض مسلمانوں نے اسلام کو سمجھنے میں غلطیاں بھی کی ہیں۔ لیکن ان غلطیوں سے اسلام کی ذات پر کوئی عیب نہیں لگایا جاسکتا۔ اور نہ ہی اسلام کے اصلی مصادر اور اس کی حقیقی صورت پر خوردہ گیری کی جاسکتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس فہم کو ہم اسلام کی حقیقی تصویر سے قریب تر سمجھ سکتے ہیں اور جس سے ہم اسلام کو سمجھنے میں مانوس ہو سکتے ہیں وہ درحقیقت صدر اول یعنی عہد صحابہ و تابعین ہی کی فہم ہو سکتی ہے۔ میرا مقصد اس بیان سے یہ نہیں ہے کہ بعد کے تمام زمانوں میں مسلمانوں نے اسلام کے متعلق جو کچھ سمجھنے کی کوششیں فرمائی ہیں میں خدانخواستہ ان کی تنقیص کروں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں بڑے بڑے علماء، محققین اور ایسے ایسے حقائق کا ادراک کرنے

والے پیدا ہوتے ہیں جن کے حلقے اور سلسلے آج تک جاری ہیں اور ختم نہیں ہوئے۔ بلکہ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ جب تک ہم اسلام کے رخ تابان سے ان حجابات و نقابات کو نہ اٹھائیں خواہ وہ ہمارے زمانہ کے ہوں یا پچھلے زمانوں کے، اسلام کی ذاتی اور حقیقی صورت ہمارے سامنے نہیں آسکتی۔ اسلام درحقیقت ایک نظامِ کامل ہے۔ وہ اپنے طور پر خود زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا تصور ہے جو خود وجود پر بھی حاوی ہے۔ اس کا تعلق صرف سمجھ لینے ہی سے نہیں بلکہ سمجھ کر اس پر یقین کرنا بھی ضروری ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی وہ ایک عملی نظام بھی ہے جس کے سوتے خود اس تصور اور ایمان ہی کے سرچشموں سے پھوٹتے ہیں۔

اسلامی تصور یا اسلامی مفہوم کا ایک عام خلاصہ یہ ہوگا کہ یہ عالمِ طبعی جو انسان کو احاطہ کئے ہوئے ہے اور یہ ساری کائنات جس میں انسان زندگی گزارتا ہے، اس کا افق اور اس کی مسافتیں کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوجائیں، یہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ یہ ساری کائنات ایک مخلوق ہے۔ جس کے اوپر ایک قوتِ خالقہ اور ایک حیاتِ مدرکہ موجود ہے۔ یہ خالق کی قوت ہے۔ اس کائنات اور اس سر زمین میں انسان بذاتہ اسی خدائے خالق کا خلیفہ ہے تاکہ وہ اس میں زندگی بسر کرے اور اس میں جو نعمتیں طبعیات اور ارزاق بلکہ حلال اور مشروع لذات کی پائی جاتی ہیں ان سے استفادہ کرے مگر ساتھ ہی یہ بھی اچھی طرح سمجھ لے کہ اسے اپنی اس خلافت، استفادہ، اور سعی و عمل کا حساب بھی دینا ہے اور اس قوتِ خالقہ، مدرکہ، اور محاسبہ کے سامنے ہر بات کی جوابدہی بھی کرنی ہے۔ اس فہم اور ایمان سے عمل اور عبادت کے دو ہموار پہلو اور سوتے پھوٹتے ہیں جن میں شدید اتصال پایا جاتا ہے۔ یعنی مثلاً زمین میں کھیتی کرنا اور ساتھ ہی اس قوتِ خالقہ کی صنعت و کاربگری پر غور و فکر کرنا جس نے زمین کو پیدا کیا اور اس میں انسان کے لئے طرح طرح کی نعمتیں پیدا کیں۔ یہ عمل اور عبادت دراصل ایک ہی قسم کی چیزیں ہیں۔ چنانچہ وہ جب زمین میں ہل چلاتا ہے یا اپنے ہاتھ سے ہل کو حرکت دیتا ہے تو وہ خدا کی ہی اطاعت کرتا ہے۔ وہ اس طرح جہاں اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ہے وہیں اسی کا عبادت گزار بھی ہے۔ اسی طرح جب وہ دن کی چند ساعتوں میں تنہائی میں اپنے

خالق کا تصور کرتا ہے اور غور کرتا ہے کہ اس موجودہ زندگی کے بعد جو ابدھی اور حساب کا مرحلہ بھی پیش آنا ہے تو وہ اس وقت بھی خدا کا مطیع ہوتا ہے۔ اس فکر یا اس عقیدہ یا اس ایمان کے ماتحت صحیح طور پر کچھ اخلاقی تعلیمات جنم لیتی ہیں۔ یہ تعلیمات ایک طرف تو زندگی کے کچھ واقعی مسائل کو حل کرتی ہیں اور دوسری طرف وہ روحانی ترقی کے لئے بھی کام کرتی ہیں۔ اس طرح وہ اذہان کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کر دیتی ہیں۔ انہیں متعین حدود میں کام کرنے کا موقعہ دیتی ہیں اور ان میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں اور اس انداز سے کام کرتی ہیں کہ اس کے تمام اعمال اخلاقی اور روحانی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میں اس موقعہ پر اسلام کے اخلاقی نظام کی تلخیص اس سے زیادہ الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ پھر وہ انسان جو اس طرح کا ایمان رکھتا ہو اور زندگی میں اس انداز پر عمل کرتا ہو وہ تنہا ایک فرد نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو ایک اجتماعی ہیئت کا حصہ ہوتا ہے اور اسی اجتماع میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اسلام ہی اس کے رجحانات، صفات اور افراد کے ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعلقات کی حد بندی کرتا ہے۔ اسلام اس فرد کی تکمیل کا سامان اس حیثیت سے کرتا ہے کہ وہ ایک معاشرہ یا ہیئت اجتماعیہ کا جزو ہے۔ اس کے لئے ایسے قوانین اور ہدایات صادر کرتا ہے جس میں فرد کی مصلحت اور جماعت کی مصلحت پورے اعتدال و توازن کے ساتھ جمع ہو جاتی ہیں۔ وہ اس کے لئے ایک نظام اجتماعی قائم کرتا ہے جو اس کی انسانی یعنی مادی اور روحانی ترقیات کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ نظام اجتماعی نظام حکومت پر بھی مشتمل ہوتا ہے جس کی بنیاد و اساس، شوری، مساوات، عدالت اور جو ابدھی کے تصور پر قائم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نظام اجتماعی ایک اقتصادی نظام بھی پیش کرتا ہے جو ایک طرف عدالت اور انصاف پر مبنی ہوتا ہے اور دوسری طرف باہمی اجتماعی کفالت پر بھی مبنی ہوتا ہے۔ وہ نظام اجتماعی ایک ایسے عائلی نظام پر بھی مشتمل ہوتا ہے جس میں ایک طرف ابتدائی دور کے آزاد فطری رجحانات کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور ساتھ ہی ایک تربیت یافتہ سلیم الطبع ہیئت اجتماعیہ کا رنگ بھی منعکس ہوتا ہے۔

یہ ہیئت اجتماعیہ جس کے سیاسی، اقتصادی اور عائلی پہلوؤں کی اسلام تنظیم کرتا ہے تاکہ انسان اس کے ذریعہ سے سعادت و ارتقاء کی منزلیں طے کرسکے دراصل چند اخلاقی اور اعتقادی بنیادوں پر ہی قائم ہے۔ جو اس کے نظام کے تنوں اور اس کی عمارت کی بنیادوں کا کام دیتی ہیں۔ چنانچہ اسلامی تشریح جو اپنے موضوع اور تنظیم کے اعتبار سے چند ظاہری بنیادوں اور موضوعی ضوابط پر مبنی نظر آتی ہے دراصل خود انسانی نفس میں اس کے اخلاقی بیج اور اعتقادی اصول جاگزیں ہوتے ہیں۔ وہی اسے غذا دیتے، اسے نشوونما دیتے، اور استحکام بخشتے ہیں۔ لہذا ایک ایسی تشریح جس کا تعلق اخلاق سے منقطع نہ ہو، خواہ ان دونوں کی الگ الگ بنیادیں بھی کیوں نہ ہوں، کسی دوسرے انداز تشریح کے ساتھ ملتبس نہیں ہو سکتی۔ یہ اخلاق، خود بالذات یا عام فلسفہ یا کامل اعتقاد پر منحصر ہوتے ہیں۔

اس طرح اسلامی نظام میں اس کا عقیدہ یا فلسفہ اور اخلاقی اور اجتماعی تشریح، سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مکمل وحدت کی تشکیل کر لیتے ہیں۔ جو زندگی کی وحدت کا سامنا کرتی ہے۔ اسلامی نظام کی یہی سب سے بڑی فضیلت ہے جو اسے دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتی ہے۔ کیونکہ تمام دوسرے نظام زندگی کے پہلوؤں میں سے محض کسی ایک پہلو ہی کی رعایت کرتے ہیں اور یہ تمام پہلو ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کی طرف اس حیثیت سے غور ہی نہیں کرتے کہ وہ ایک مکمل وحدت ہے۔ وحدت توازن، ترتیب و عمومیت ہی وہ خصائص کبریٰ ہیں جو اسلامی نظام کو دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتے ہیں خواہ وہ نظام مادی ہوں یا روحانی ہوں یا دینی ہوں۔

### اسلامی نظام میں نسبتوں کی تعیین

اسلامی نظام میں وحدت کی خصوصیت کے علاوہ اسی کے پہلو بہ پہلو ایک دوسری خصوصیت بھی ہے جو اپنی اہمیت میں کسی طرح بھی وحدت کی خصوصیت سے کم نہیں ہے۔ اور یہ خصوصیت زندگی کے پہلوؤں اور اس کی اقدار کے درمیان نسبتوں کی تعیین ہے۔ چنانچہ مال۔ لذت۔ عمل۔ عقل۔ معرفت۔ قوت۔ عبادت۔ قربت۔ قومیت۔ اور انسانیت وغیرہ زندگی کی اقدار

میں سے چند قیمتی اقدار ہیں۔ اسلام نے اپنے نظام حیات میں ان سب کا مرتبہ اور مقام متعین کر کے ایک نسبت مقرر کر دی ہے کہ وہ اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ تاکہ کوئی قدر، کسی دوسری قدر پر زیادتی نہ کر سکے۔ چنانچہ ان اقدار کی نسبتوں میں کوئی ایسی تبدیلی عمل میں لانا کہ کوئی قدر اپنی حد سے بڑھ جائے اور کوئی قدر دوسری اقدار کی نسبت سے گھٹ جائے، اسلام کے لئے خالص ملمع کاری اور فریب ہے۔ جیسا کہ عملاً ہمارے آخری ادوار میں ہو رہا ہے۔ زندگی کے نظام میں نسبتوں کے درمیان کوئی تبدیلی عمل میں لانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مصور کارٹون بناتے ہوئے جسمانی نسبتوں میں تغیر و تبدیل کر دے۔ جس میں انسان کے اہم اعضاء اور اجزاء تو سب کے سب موجود ہوں لیکن وہ اس انداز سے ہوں کہ ان سے مسخرہ پن اور استہزاء ٹپکتا ہو۔ یا جیسے کسی مرکب دوا کے اجزاء میں نسبتوں اور اوزان میں تبدیلی کر دی جائے جس سے دوا کا مقصد ہی فوت ہو جائے اور اس کی ساری صفات اور خصوصیات بدل جائیں بلکہ بسا اوقات وہ بجائے فائدہ رساں ہونے کے ضرر رساں بلکہ مہلک بن جائے۔ لہذا اگر ہم زندگی کے مثلاً سو جزو فرض کر لیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اسلام نے ان میں سے عبادت کے لئے چند اجزاء مخصوص کر دیے ہیں، انفاق - کسب - جہاد - مشروع لذتوں سے استفادہ وغیرہ، ہر بات کے محدود حصے مقرر ہیں۔ اگر ہم ان نسبتوں کو بدل دیں اور مثلاً جہاد کی قیمت گھٹا کر عبادت کی قیمت میں اضافہ کر دیں اور مثلاً مال کا حق کسب و انفاق پر دو اعتبار سے گھٹا دیں اور لذتوں کو گراں کر دیں یا انہیں لغو قرار دیدیں تو اس طرح ہم اسلام کے نظام سے ٹکل کر کسی اور نظام میں داخل ہو جائیں گے جو اپنی حقیقت اور روح کے اعتبار سے اسلامی نظام کے خلاف ہوگا۔ اس طرح ہم اس توازن کو برباد کر دیں گے جو اسلام نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں قائم کیا ہے۔ چنانچہ آخری ادوار میں کامل مسلمان اسے سمجھا جاتا تھا جو ہر وقت عبادت میں مصروف رہے یہاں تک کہ کسی اور مشغلہ سے اسے سروکار ہی نہ ہو۔ محراب مسجد میں ہمہ وقت معتکف رہے اور اس سے کبھی جدا ہی نہ ہو۔ اپنے اذکار و اوراد میں چوبیس گھنٹے مصروف رہے۔ یہ صورت حال یقیناً اس صورت سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور



آپ کے اصحاب نے جو آپ کے بہترین پیروکار تھے اپنی زندگی گزار دی تھی۔ اگر عبادت ہی ان کی زندگی کا بنیادی جزو ہوتا تو وہ جہاد کی طرف کبھی بھی مائل نہ ہو سکتے۔ معاشرہ کو فاسد عقائد سے آزاد کرنے کی راہ میں جہاد صحیح عقائد کو لوگوں کے قلوب میں راسخ کرنے کے لئے جہاد - ظلم و استبداد سے نجات دلانے کے لئے، کمزوروں کی حمایت کے لئے، لوگوں کے درمیان عدل کے قیام کے لئے، جہاد کرنے کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہ رہتا۔ بالکل اسی طرح ایسے مسلمانوں کی زندگی بھی جو ہمہ وقت جہاد اور اصلاح معاشرہ ہی میں مصروف رہیں، اسلام کی مکمل تصویر کے مقابلہ میں ناقص ہی کہلائے گی جب کہ اس کی زندگی عبادت کے عنصر سے بالکل ہی خالی ہو اور خدا کے ساتھ اس کا تعلق کمزور ہو۔

ہمارے فقہائے متقدمین کو اس تصور یعنی باہمی نسبتوں کے تصور کا پورا پورا احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان فرائض وغیرہ کو جن کا ایک مسلمان سے مطالبہ کیا جاتا ہے قوت کے اعتبار سے متفاوت درجات میں تقسیم کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ انہوں نے ممنوعات اور محرّمات کے الگ الگ درجے قرار دئے ہیں۔ چنانچہ گناہ کے اعتبار سے وہ مجاہد اور سرحد کا محافظ جو جہاد کی صف میں اپنی جگہ کو چھوڑ دے اور وہاں دشمن کو گھس جانے کا موقعہ دیدے، اس شخص کے برابر نہیں ہوتا جو شراب پی لیتا ہے یا سور کا گوشت کھالیتا ہے۔ حالانکہ دونوں باتیں از روئے شریعت حرام ہیں۔ قرآن کریم کی آیات اور بیس شمار احادیث بھی اس تصور یعنی تعیین مراتب کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”اجعلتم سقایة الحاج وعمارة المسجد الحرام کن امن بالله والیوم الاخر وجاهد فی سبیل اللہ لایستوون عند اللہ“ (کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلا دینے اور مسجد حرام کو آباد رکھنے کو ان لوگوں کے اعمال کے برابر سمجھ لیا ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ سب اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہو سکتے۔) (سورہ التوبہ آیت ۱۹)۔

اگر ہم اس نوعیت کی احادیث جمع کرنا شروع کر دیں جو بعض اعمال

کی قدر و قیمت کچھ دوسرے اعمال کے مقابلہ میں متعین کر دیتی ہیں تو ہم زندگی کی اقدار کی ریاضی کی کسور کے ساتھ نسبتیں مقرر کر سکتے ہیں۔ مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ امام عادل کا ایک دن کا عمل ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہوتا ہے (۱) نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے کہ ایک عالم کی فضیلت ایک عبادت گزار آدمی پر ایسی ہی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر (۲) نیز آپ ہی کا ارشاد ہے کہ ایک فقیہ شیطان پر بہ نسبت ہزار عابدوں کے زیادہ گران ہوتا ہے (۳)۔

اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو سکتی ہے جو اپنی تمام تر توجہات کا رخ کسی ایک امر کی طرف موڑ دیتے ہیں جو اسلام میں فی ذاتہ مطلوب یا ممنوع ہوتا ہے۔ جب کہ اس کے مقابلہ میں دوسرے امور بھی ہو سکتے ہیں جو اہمیت میں اس سے بھی بڑھے ہوئے ہوں۔ مثلاً آج کل اسلامی ممالک دو بڑے خطرات سے دوچار ہیں ان میں سے ایک استعمار ہے اور دوسرا العاد جن میں سے ایک زمین پر استیلاء اور غلبہ ہے۔ اور دوسرا عقیدہ پر استیلاء اور غلبہ۔ یعنی اسلامی ممالک کی مادی اور معنوی دونوں قسم کی ثروتوں کا سلب و نہب۔ چنانچہ اگر کسی ملک پر مکمل استیلاء حاصل ہو جائے اور وہاں کے باشندوں کے عقائد کو ختم کر دیا جائے اور یہ صورت حال کچھ عرصہ تک قائم رہ جائے تو دینی شعائر کو قائم کرنے، اسلامی اوامر کی تعمیل کر لے، اس کے احکام کی اپنے حالات سے تطبیق دینے کے مواقع ہی کہاں باقی

(۱) ایک روایت میں ہے کہ ایک گھنٹے کا عدل و انصاف ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے یعنی تمام رات کے قیام اور دن بھر کے روزہ سے افضل ہے۔ اور ایک گھنٹے کا ظلم ساٹھ سال کے گناہوں سے زیادہ سخت ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں بیان کیا ہے۔

(۲) اس حدیث کو ترمذی نے بیان کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔

(۳) اس حدیث کو ترمذی نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ صرف ولید بن مسلم اسکا راوی ہے۔

رہ سکتے ہیں؟ لہذا لوگوں کے اذہان کو دوسرے معاملات کی طرف  
 موڑنا اور انہیں اسلامی تنازعات کا محور بنا لینا درحقیقت بنیادی معاملات  
 سے انہیں غافل کر دینا ہے۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی چیز اسلامی  
 ممالک پر براہ راست یا بالواسطہ طور پر مغربی تسلط و استیلاء ہے اور ان  
 مغربیوں کا مختلف طریقوں اور اسلوبوں سے اسلامی عقائد کی بیخ کنی کرنا اور  
 ملحدانہ افکار و مذاہب کی اشاعت ہے جس کی صورتیں ہر جگہ مختلف ہیں۔  
 تو کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہوگا کہ مسلمانوں کو گروہوں میں  
 تقسیم کر دیا جائے جن میں سے کچھ تو یہ کہہ رہے ہوں کہ تراویح  
 کی رکعتیں آٹھ ہیں اور کچھ یہ دعویٰ کرتے ہوں کہ نہیں، یہ بیس، ۲۰  
 ہیں۔ کچھ کا یہ نظریہ ہو کہ ایک مسجد میں دوبارہ جماعت سے نماز  
 پڑھنا جائز ہے اور کچھ ان کے برخلاف اسے ناجائز سمجھتے ہوں۔ یا  
 سنت اور بدعت کے معرکے ایسے معاملات میں برپا کرنا جن کا عقائد  
 سے کوئی تعلق نہیں۔ مدعا یہ نہیں ہے کہ ان موضوعات پر علمی انداز  
 سے بھی بحث نہ کی جائے۔ بلکہ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس قسم کی  
 تشبیہات اس وقت ضروری ہو سکتی ہیں جب کہ عقائد و عبادت تک کوئی  
 بات پہنچ جائے۔ تو ایسی صورت میں عبادت وغیرہ کے متعلق صحیح طریقہ کی  
 طرف متنبہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ عبادت کا معاملہ ایسا ہے کہ  
 وہ سب کی سب توفیقی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ حکم  
 دیدیا ہے یا کر کے دکھا دیا ہے اس میں نہ کمی کی جا سکتی ہے نہ  
 زیادتی۔ لیکن اس کے باوجود اگر اس سے بھی کوئی فتنہ پیدا ہوتا ہو یا  
 مسلمانوں کی دو جماعتوں میں خصومت یا عداوت کی آگ بھڑکتی ہو تو میرے  
 خیال میں اسے بھی چھوڑ دینا واجب ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ایک ایسی  
 ناگوار صورت حال پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جو اس اصل منکر (ناپسندیدہ عمل)  
 سے بھی زیادہ منکر ہے۔ موجودہ احوال و ظروف میں مسلمانوں کی قوت کو  
 پراگندہ کر دینا اور عظیم بنیادی مقاصد کو چھوڑ کر فروری باتوں کی طرف  
 متوجہ ہونا کسی صورت جائز نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ تو مسلمانوں کو  
 چھوٹی چھوٹی متعدد ٹکڑیوں میں تقسیم کر دینا ہے جو ان حالات میں خطرناک  
 ترین جرم ہے۔

## اسلام اور جدید مشکلات کا مقابلہ

(۱) نصوص کو سمجھنے میں تکلیف

مسلمانوں کو جب اس زمانہ میں مغربی تہذیب کا سامنا کرنا پڑا تو مسلمانوں نے مختلف موقف اختیار کئے کیونکہ انہیں متنوع حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ بعض اوقات مسلمانوں نے اسلام کی پیمائش دوسرے پیمانوں سے اور اس کے مسائل کا اندازہ ان اقدار سے کرنا شروع کر دیا جو مسلمانوں کے اپنے نہیں تھے۔ بلکہ دوسرے غیر مسلم نظاموں سے مانگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی نظر آئے جو اسلامی نصوص کو سمجھنے میں تکلف برتنے اور الفاظ کے مدلولات کو سمجھنے میں ٹھوکریں کھانے لگے۔ اس کی مثال میں وہ لوگ پیش کئے جا سکتے ہیں جو مالی ٹیکسوں کے شعبہ کا بالکلیہ انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام میں مالی ٹیکسوں کا کوئی وجود ہی نہیں اسلام میں صرف زکوٰۃ ہے اور اس کے سوا کوئی ٹیکس نہیں۔ اگر یہ انکار کرنے والے دقیقہ رس ہوتے اور انہیں ذرا بھی واقفیت ہوتی تو ان کو یہ بات معلوم ہونی چاہئے تھی کہ ٹیکس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مال کی ایک مقررہ مقدار ہوتی ہے جسے حکومت لوگوں سے جبراً وصول کرتی ہے اس کا ایک متعین طریقہ ہوتا ہے جو مال کی مجموعی مقدار پر ایک محدود نسبت سے عائد کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ٹیکسوں کے سلسلہ میں اسلام کے موقف کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ اسلام بعض ٹیکسوں کو برقرار رکھتا ہے اور بعض ٹیکسوں کا انکار کرتا ہے۔ خود زکوٰۃ ہی کو لے لیجئے وہ بھی ایک مالی ٹیکس ہی تو ہے۔ یہی حال مثلاً خراج اور جزیہ کا ہے۔ اگر ہم یہ سوال پیش کریں کہ کیا حکومت کا لوگوں پر ایسے ٹیکس لگانا جائز ہے جن کے متعلق کوئی شرعی نص وارد نہ ہوئی ہو۔ تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ اسلام نے ایک قانون بنا دیا ہے جو اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے جو صحیح ترمذی میں نقل ہوئی ہے۔ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

” فی المال حق سوی الزکوٰۃ “ (مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہوتا ہے)

اس حدیث نے حق کی کوئی تحدید نہیں فرمائی۔ اگر ہیئت اجتماعیہ کی مصلحت مال خرچ کرنے کی مقتضی ہو اور بیت المال میں اتنا مال موجود نہ ہو جو

کفایت کر سکے اور یہ مصلحت بھی ضروری ہو؛ مثلاً اسلامی مملکت کا دفاع یا فقرا و مساکین کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اگر اموال زکوٰۃ کافی نہ ہو سکتے ہوں اور مزید اموال کی ضرورت ہو تو حکومت اور مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ صاحب مقدرت لوگوں کے اموال میں سے اتنا مال لے لے جو اس ضروری احتیاج کے لئے کافی ہو سکے۔ اس بناء پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ٹیکس لگانا فی نفسہ کوئی معیوب بات ہے۔ البتہ اگر حاکم کوئی ایسا مالی ٹیکس لگا دے جس کا کوئی واقعی جواز موجود نہ ہو یا اس سے لوگوں کی ایک بڑی جماعت پر ظلم و ستم ہوتا ہو، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ حاکم نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے جسے اسلام قبول نہیں کرتا۔ اس بات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں کہ ٹیکس ("خزیرہ") کا لفظ یا اصطلاح، جدید زمانے کی پیداوار ہے۔ یہ لفظ یا اصطلاح قدیم زمانہ میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لفظ یا اصطلاح کے نئے ہونے سے یہ استدلال تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مدلول اور اس کے معنی بھی قدیم زمانہ میں موجود نہیں تھے۔ بلکہ حقیقت حال تو اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ اس کا مدلول (یعنی رعیت کے مال میں حکومت کی طرف سے اپنے لئے کچھ حصہ مقرر کر دینا) قدیم زمانہ میں بھی معروف تھا۔ حتیٰ کہ خود زکوٰۃ بھی دراصل اس وسیع مفہوم کے تحت آتی ہے۔ البتہ زکوٰۃ ٹیکس کی کم سے کم مقدار ہے جو لامحالہ ضروری ہے۔ اور جب ہم اس حدیث پر غور کریں جو یہ بتا رہی ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی دوسرے حقوق ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اس دوسری حدیث پر بھی غور کریں جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ "ہم ایک مرتبہ حضور کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ یکایک ایک آدمی اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر آیا اور دائیں بائیں نظریں گھمانے لگا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ سواری ہو تو وہ اسے دیدے جس کے پاس سواری نہیں ہے۔ اور جس کے پاس ضرورت سے زیادہ زاد راہ ہو تو وہ اسے دیدے جس کے پاس زاد راہ نہیں ہے۔ اور اس کے بعد آپ نے مال و دولت کی بہت سی انعام بیان فرمائیں حتیٰ کہ ہمیں نظر آنے لگا کہ ضرورت سے زیادہ کسی چیز میں بھی ہمارا اپنا کوئی حق نہیں ہے۔" مجھے عرض

کرنے دیجئے کہ جب ہم ان دونوں حدیثوں پر غور و فکر کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے (جیسا کہ ہمارے فقہائے کرام نے بھی بیان فرمایا ہے) کہ جب ضرورت مقتضی ہو اور مصلحت عامہ کا مطالبہ ہو تو وہ لوگوں کے ایسے اموال سے جو ان کی اصل اور بنیادی ضرورت سے زیادہ ہو اتنا کچھ لے سکتی ہے جس سے وہ ضرورت اور مصلحت عامہ پوری ہو سکے۔ اس حد سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ضرورت سے زیادہ اموال کی ملکیت کے معنی اسلامی مفہوم میں یہی ہیں کہ وہ اس نوع کی ملکیت ہے جسے حکومت وقت ضرورت اور مصلحت عامہ کے حدود کے ساتھ محدود کر سکتی ہے۔ البتہ ضرورت اور مصلحت کا اندازہ کرنا حاکم کی خواہشات کے تابع نہیں۔ بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ شریعت کے ان مقاصد کی روشنی میں جو شرعی نصوص سے مستنبط ہوں ان کا اندازہ لگایا جائے۔ اور صرف ضرورت ہی کی حد تک رہا جائے اس سے تجاوز نہ کیا جائے۔ ہمارے فقہائے کرام نے بھی ان حالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جن میں حکومت کو مالداروں کے اموال یا لوگوں سے زائد از ضرورت اموال لے لینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ ضروری احتیاج کو رفع کیا جا سکے۔

(باقی آئندہ)

و یسئلونک ما اذا ینفقون قل العفو

(البقرة: ۲۱۹)

اور تم سے پوچھتے ہیں ہم (راہ حق میں) کیا خرچ کریں؟ ان سے کہہ دو کہ جس قدر (تمہاری ضروریات معیشت سے) فاضل ہو (خرچ کرو)۔